غنی کشمیری کی عظمت اور کشمیریت کے چند پہلو

پروفیسر مرغوب بانہالی
صدر شعبۂ کشمیری

۱۰۷۹ھ میں وفات پانے والے ملا محمد طاہر غنی کشمیری کی زندگی کے بیشتر حالات اب تک پردۂ خفا میں پڑے ہوئے ہیں اور ان پر سنجیدگی سے کام کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں تذکروں سے کہیں زیادہ مددگار اس ضمن میں کلام غنی سے فراہم ہونے والی داخلی شہادت ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس کو معاصر معاشی اور معاشرتی حالات پر منطبق کر کے روشن تر بنایا جائے۔ ایسا کرنے سے حیات غنی سے متعلق قائیم کئے گئے مفروضات ٹوٹ سکتے ہیں اور نہ صرف غنی کے خاندان۔ پیشے اور عقیدے کی نشاندہی آسان بن سکتی ہے بلکہ اس کے تخلیقی ذہن پر حاوی رہے ہوئے ذاتی اور قومی سطح کے غم و آلام کی قابل فہم توضیح و تفسیر بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ یہاں پر تمہید کے طور پر یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غم و آلام

کے معاملے میں غنی کشمیری اور مرزا غالب ذاتی اور قومی سطحوں پر ایک جیسی کیفیات سے دوچار دکھائی دیتے ہیں ذاتی سطح پر غنی کے یہاں خرابیٔ صحت کا پہلو اور غالب کے یہاں نجی پریشانیوں کا پہلو غالب نظر آتا ہے لیکن قومی یا ملکی سطح پر دونوں اپنی اپنی بستی کو اغیار کی پامالی میں پڑا دیکھ کر اور انکی طرف سے توڑے جانے والے مظالم دیکھ کر پہلے تو اندر ہی اندر کڑھتے ہیں۔ پھر غم روزگار کو غم دلدار بنا کر تطہیر جذبات کے لئے دونوں اُن پامال اور مفلوک الحال ہم وطنوں کی حالت زار پر نہ صرف خون کے آنسوں بہاتے ہیں بلکہ اغیار کی بے مروتی کا خاتمہ چاہتے ہوئے انقلاب کی آرزو بھی کرتے ہیں اور زندہ شاعر ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ گویا وہ نہ فقط اقبال سے بہت پہلے اس کیفیت سے گذرتے ہیں جس نے اقبال سے یہ کہلوایا ہے کہ ؎

خون دل نوشیدن و ہمواره خندان زیستن
نیست کارِ ہر کسے ایں شیوۂ مخصوص ہست

گویا یہ دونوں گرد و پیش کے انسانیت سوز حالات کو ایک باد مخالف قرار دیکر اس کے مقابلے میں بڑی دیدہ ورانہ بصیرت اور سخنورانہ جسارت سے کام لے کر اپنی اپنی شمع امید کو فروزاں رکھنے کے جو خدمت آڑے وقت پر انجام دیتے ہیں وہ خود ان کے کلام کو امتیاز اور عظمت عطا کرنے کی ایک اضافی خصوصیت بن جاتی ہے کیونکہ عظمت پانے کے لئے فکر اور فن دونوں کی بالیدگی لازمی ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

ان دونوں شاعروں کو حسن اور اس پہ حسن ظن کے مصداق نہ صرف اپنی فنکارانہ صلاحیتوں پر اتنا اعتماد اور ناز ہے جو کبھی کبھی رعونت کی حدود کو چھو لیتا ہے یہ دونوں نہایت حساس اور نازک مزاج بھی واقع ہوئے ہیں۔ ان تمام تر مماثلتوں سے زیادہ قابل دونوں کی شعری رویوں کی مماثلت ہے۔ جس کو خورشید السلام جیسا نقاد سمجھ نہ سکنے کے باعث کوتاہ نظری کا شکار ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ غالب کے مقابلے میں غنی کو ایک سطحی شاعر قرار دینے کا فتویٰ صادر کرنے تک پہنچ گیا ہے۔ میں اسی ناقدانہ کوتاہ نظری کے زوردار تردید کے لئے مقالے کے آغاز میں غنی کے ایک ایسے امتیاز کی ٹھوس نشاندہی کرنے جا رہا ہوں جو چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق مجھے یہ بتانے کی گستاخی کا ارتکاب کرا رہی ہے کہ غالب باآن ہمہ عظمت ایک عرصہ تک پروردۂ نوازشاتِ غنی اور خوشہ چین موضوعاتِ غنی رہا ہے اور غنی کے اس اعلان کے باوجود کہ کوئی دزدِ دلا اور مابدولت کے کلام کے مضامین کو چرا نہیں سکتا۔

ز مضمون دزدی یاران نمے باشد غمی مارا
چنان بستیم مضمون را کہ نتواند کسے بردن

جناب غالب نے ایک نہیں غنی کے درجنوں مضامین شبرنگی مہارت سے اڑا لے جانے کا کمال دکھایا ہے اور اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ غالب کو میر تقی میر کی جیسی توفیق بھی

بھی میسر نہ ہوئی جس نے اپنے تخلیقی سرچشمے کا باضابطہ نام لے کر اور دیوان غنی کے سامنے رکھ کر طبع آزمائی کرنے کا دیانتدارانہ اظہار یوں کیا ہے ؎

کچھ گدا شاعر نہیں ہوں میر میں
تھا مرا سرمشق دیوانِ غنی

میر کے برعکس غالب نے غنی سے بے حد استفادہ اور اکتساب کے باوجود اپنے اس محسن اور مربی کا کہیں پر بھی اس اہتمام سے نام نہیں لیا ہے جس اہتمام سے اس نے حافظ و صائب یا ظہوری و نظیری یا میر و بیدل کا نام لیا ہے۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ غالب نے دزدی کے الزام سے بچنے کے لئے حفظ ماتقدم کے طور پر نفسیاتی اقدام کیا ہے تاکہ خود غالب سے اپنے تخلیقی سرچشمے کا نام سن کر نظر باز حاسدین یہ نہ کہہ اٹھیں کہ ؏

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

اتنی تلخ تمہید باندھ لینے کے بعد اب میں غالب کے چند ایسے شعر پیش کرتا ہوں جن میں مضامین شعری سے لے کر الفاظ کی در و بست اور شایستہ سخن گستری کی حد تک ساری باتوں میں غنی کی روح بولتی دکھائی دیتی ہے معاملہ آپ کی صوابدید اور بالغ نظری پر چھوڑنے کے لئے معنوی ماخذوں کا درجہ رکھنے والے اشعار غنی کشمیری بھی درج کرتا ہوں۔

غنیؔ کا ایک شعر ہے ؎

شدیم خاک زبس در خیال عارض او
سزد اگر گلِ خورشید روید از گلِ ما

غالبؔ کا اس مضمون پر مبنی شعر ہے ؎

لالہ و گل دمد از خاک مزارش پس مرگ
تا چہا در دل غالب ہوس روے تو بود

غنیؔ کا دوسرا شعر ہے ؎

شنید نالہ مرغ چمن مگر در خاک
کہ میدمد مددِ تہ خاک گل گریبان چاک

غالبؔ نے اس شعر کا چربہ یوں اتارا ہے ؎

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

غنیؔ کا شعر ہے ؎

جلوۂ حسنِ ترا آرد مرا بر سر فکر
تو حنا بستی و من معنیٔ رنگین بستم

غالبؔ کا شعر ہے ؎

اسدؔ اٹھا قیامت قامتوں کا وقت آرائش
لباس نظم میں بالیدن مضمون عالی است

Scanned with CamScanner

غنی کشمیری اپنے ایک دلپسند مضمون کو دو شعروں میں یوں پیش کرتا ہے ؎

۱۔ مارا چو شمع مرگ ــــ بود خامشی غنی
اظہار زندگی بزبان سے کنیم ما

۲۔ شد رد شنم از شمع کہ در بزم حریفاں ـــ
خاموش شدن مرگ ـــ بود اہل زبان را

غالب نے غنی کے اس دلپسند مضمونِ شعری کو اپنے دیوان کی زینت یوں بنایا ہے ؎

زبان اہل زبان میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

ملاحظہ فرمائیے کہ غنی کے دوسرے شعر میں جو بات بزم حریفاں میں اہل زبان کی خاموشی کو موت کے مترادف قرار دیکر پیدا ہوگئی وہ غالب کی تمامتر صناعی اور نقالی کے باوجود پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ خاص طور پر شعر کے آغاز میں زبان اہل زبان جیسی تکرار غیر اور شعر کے خاتمہ پر زبانی شمع جیسی ترکیب غیر مانوس برتنے سے نفس مضمون مجروح ہوگیا ہے۔ حالانکہ الزام سرقہ سے بچنے کی ایک صورت غنی کو اہل زبان قرار دیکر پیدا کی گئی ہے جو غالب کی ہوشیاری کی آئینہ داری ضرور کرتی ہے۔ غنی کا ایک شعر ہے ؎

پیکر ساقی سراپا گوئی از گل ساختند
دست گل، پا گل، بدن گل، چہرہ گل، رخسار گل

غالبؔ نے غنیؔ کی متابعت میں محبوب کے سراپا کو گلستان سے قرار دیا ہے اور وہ بھی بند قبا کھل جانے کی شرط رکھ کر. یوں ؎

اسد بند قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں یک عالم گلستاں ہے

غنیؔ کشمیری نے انسان کی ایک بشری کمزوری کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ انسان کی قوتیں مضمحل ہو جانے بڑھاپا چھا جانے کے باوجود اس میں خواہش گناہ نہیں مرتی چنانچہ آپ بیتی کے پردے میں جگ بیتی سناتے ہوئے اس نے مذکورہ انسانی رجحان کی عکاسی یوں کی ہے ؎

ہر چند شد تنہی ز سیاہی دوات سر
مشق گناہ ہنوز چو اطفال مے کنم

غالبؔ نے غنیؔ کے اس تجربے کو ایک قدم آگے بڑھایا ہے یوں ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر مے آگے!

غنیؔ سے بالواسطہ اکتساب و استفادہ کرنے کے اس سلسلے کو غالب نے تشکر سے یاد نہ کرنے کے باوجود بہت دور تک بڑھایا ہے. چنانچہ غالب کے اور بھی درجنوں اشعار ہیں جو اس لحاظ سے توجہ طلب ہیں. ایسے اشعار میں سے بعض کی بہت اچھے

نشاندہی میرے دوست محمد یوسف ٹینگ صاحب نے بھی اپنے ایک کشمیری مضمون میں کی ہے جو ۱۹۷۵ء کے "سون ادب" میں چھپا ہے وہ اس موضوع کے چند اور گوشوں کو اجاگر کرسکتا ہے۔

یہاں پر غنیؔ کے حوالے سے تمہید اً صرف یہ جتلانا مقصود تھا کہ غنیؔ استادانہ رول سے صرف نظر ممکن نہیں۔ اسی طرح سے اگر کوئی بڑا شاعر بھی اپنے کسی بلند قامت پیشرو کے مضامین ومطالب سے استفادہ کرنے ادبی دیانت کا حق ادا نہ کرے تو وہ بھی قابل پرسیدنی ہے۔

میر تقی میرؔ کی طرح ہی بلکہ اس سے بھی والہانہ انداز سے غنیؔ کی عظمت کو خراج عقیدت پیش کرنے والے بڑے شاعروں میں شاعر مشرق علامہ اقبال کا نام بھی قابل توجہ ہے۔ اپنی شاہکار فارسی مثنوی "جاوید نامہ" میں اپنی عرفانی پرواز کے ایک انتہائی اونچے مقام پر مولانا رومی کی زبانی غنیؔ کی طرف متوجہ ہونے کا اشارہ یوں درج کرتا ہے ؎

گفت رومی آنچہ می آید نگر　　دل مدہ با آنچہ بگذشت ای پسر

شاعر رنگین نوا طاہر غنی　　فقر او باطن غنی ظاہر غنی

نغمہ ی مے خواند آں مست مدام

در حضور سید والا مقام

غنیؔ کا روح کشمیر بن کر اس مرشد کامل کے حضور نغمہ

سنج رہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ جس مرشد نے اقبال کے الفاظ میں ہی
خطۂ کشمیر کو ہنر ہائے دلپذیر سکھلا کر ایران صغیر بنا دیا ہے۔ مجھے اگلی بات اسی
نکتہ سے شروع کرنی ہے لیکن ضمناً یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اقبال
نے بھی اشعار غنی سے بالواسطہ استفادہ و اکتساب کر کے اپنے
اشعار کو جلا بخشی ہے صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے
غنی اپنے مسلک فقر و استغنا کے تعلق سے کہتا ہے ؎

کاسۂ خود پر مکن زنہار از خوانِ کسی
داغ از احسانِ خورشید است بر دامانِ ما

اقبال نے جہاں اس شعر کے مضمون کو اپنے شعر کا محل فارسی
میں یوں تعمیر کیا ہے۔ ؎

از منت خورشید نتوان کرد سینہ داغ
آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

وہاں اردو میں اس نے اس مضمون کئی طبع سے باندھا ہے مثلاً

نہ پکڑیں دامنِ الیاس گرداب بلا میں ہم
کہ بد تر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

خیر کسی اہم شاعر کی عظمت جتلانے کے لئے یہ کوئی ناگزیر
کسوٹی نہیں ہے کہ اس کے بعد گذرے ہوئے اہم شاعروں نے
اس سے استفادہ اور اکتساب فیض کر کے کس ڈھنگ سے اس کی
عظمت اور احسان کا اعتراف کیا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ شاعر

کا کلام ہر دور کے بلند نظر قاری کے ذوقِ جمال کو تسکین بہم پہنچانا چاہیئے ہر دور کے مسائل پر منطبق کرنے کے نتیجے میں اس کے انداز فکر اور انداز بیان سے نور بصیرت پھوٹنا چاہیئے اس ایک خصوصیت سے شاعر قصۂ قدیم وجدید کی سطح سے بلند ہو کر ایک لافانی تخلیق کار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ غنی کو ایک ایسا ہی تخلیق کار ہونے کی سعادت حاصل ہے اس کا دیوان اپنے زمانے کی آئینہ داری کرنے کے علاوہ احوال نامۂ کشمیریان سے معاصر ہونے کی حیثیت سے بھی ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔

عظیم فرزندِ کشمیر علامہ اقبال نے اپنے اس پیشرو کشمیری شاعر کے کلام کے درد و سوز سے معمور زرین لہر کو بخوبی پہچان لیا تھا۔ بلکہ اسی پہچان کی بدولت جہاں وہ کشمیریوں پر ایک عرصہ دراز سے روا رکھے گئے مظالم کے نتائج دیکھ کر یوں گویا ہوتے ہیں کہ ؎

توڑ اس دستِ جفا کش کو یارب جس نے
روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

وہاں وہ غنی کے شعر کو استحصالی عناصر کے ہاتھ مضبوط بنانے والے بعض دوست نما دشمنوں کو دیکھ کر کبھی غنی کے اس شعر پر یقین کرتے ہیں ؎

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعان را تماشا کن
کہ روشن کرد نورِ دیدہ اش چشمِ زلیخا را

اور کبھی درد و کرب میں ڈوبے ہوئے اس زہر آشام

طنزیہ شعر کو جاوید نامہ کی زینت بنا لیتے ہیں ؎

جمع کردم مشت خاشاکے کہ سوزم خویش را
گل گمان دارد کہ بندم آشیان در گلستان

غنیؔ کی جب الوطنی کسی تنگ نظری، علاقائی عصبیت یا محدود وطن پرستی کی آئینہ دار نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ابو طالب کلیم۔ حاجی محمد جان قدسیؔ، ظفر خان احسن اور صائب تبریزی جیسے لوگ اس کے بہترین دوستوں میں شامل نہ ہوتے۔ البتہ غنیؔ کو ایک دردمند کشمیری کی حیثیت سے اس بات کا دکھ ہمیشہ رہا کہ فارسی شعراء نے شہنشاہ اکبر کی جانب سے کشمیر کو اپنی قلمرو میں شامل کر لینے کی کاروائی کے بعد یوں تو مناظر کشمیر پر قصیدوں کا لمبا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ لیکن کشمیریوں کی ابتر حالت پر وہ شعراء حضرات بھی متوجہ نہیں ہوتے تھے بعض شعراء کی دربار پرستی نے غنیؔ کو دن رات ایک طبع کی بے چینی میں ڈال رکھا تھا۔ یہ ان کے رویہ کے خلاف غنیؔ کے خاموش احتجاج کی ایک صورت معلوم ہوتی ہے کہ اس نے کشمیر سے باہر جانا تک کبھی گوارا نہ کیا۔ لے دے کے احسن جیسے قدر دان (حاکم کشمیر) کے اصرار کے باوجود وہ کشمیر کو چھوڑ کر لاہور یا دہلی جانے پر ایک بار سے زیادہ راضی نہ ہوا اگر وہ کچھ وقت کے لئے ان مقامات کی طرف گیا بھی تو اس قلیل وقت کے دوران بھی وطن کی یاد غنیؔ کے دل و دماغ پر مسلط رہی ہے اس حد

تک کہ دوران سفر بھی کشمیر کی طرف ہی اس کا دھیان لگا رہا جیسا کہ اس خوبصورت شعر سے ظاہر ہے ؎

بسکہ شد زنجیر پایم رشتۂ حب الوطن
در سفر دایم چو سوزن چشم دارم در قفا

پھر کچھ دیر لاہور اور دہلی میں قیام کرنے کے دوران غنی کس قدر تنگ آجاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس کے ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے ؎

کردہ است ہوائے ہند دلگیر مرا
اے بخت رسان بباغِ کشمیر مرا
گشتم ز حرارتِ غریبی بے تاب
از صبح وطن بدہ طباشیر مرا!

یہاں پر پھر غنی کی غالب نوازی کھل کر سامنے آجاتی ہے جب غنی کے ذاتی وارداتِ قلبی کو اپنے تصرف میں لاکر متذکرہ دو شعروں کا چربہ غالب یوں اتارتا ہے ؎

شراب قند مئی ہندوستان دماغم سوخت
ز شیر خانۂ کشمیرم آورد بشراب

کون نہیں جانتا جب کسی کا وطن ایک آزمایشی دور سے گزر رہا ہوتا ہے تو وطن کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے والا شاعر نہ صرف ان تمام امکانی فوائد سے محروم رہتا ہے جو سفر اختیار کر کے اسکو دوسری

جگہوں پر حاصل ہو سکتے بلکہ وہ تو فوائد کے برعکس اہالیانِ وطن کی ترجمانی کرنے کے نتیجے میں ایک طبع سے معتوب بھی بن جاتا ہے اگر چہ ہم بات ابھی قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ غنیؔ کو بھی اس طبع کا معتوب بننا پڑا تھا لیکن اسکے کلام کی داخلی شہادت یہ باور کراتی ہے کہ غنیؔ کو وطن کے لئے چند مصیبتیں ضرور اٹھانا پڑی ہیں۔ جبھی تو وہ ایسا شعر کہہ پایا ہے ؎

ہر کہ پابندِ وطن شد می کشد آزارہا
پائے گل اندر چمن دارد پر است از خارہا

اہالیانِ وطن کی بہتری چاہتے وقت غنیؔ کی نظر اقتدار پرست اہل زر کی طرف نہیں اٹھتی۔ بلکہ ان کو بے ہودہ رنگ رلیوں اور ابن الوقتیوں میں غرق دیکھ کر غنی کہہ اٹھتا ہے ؎

بہ چشمم آب و رنگے نیست خوان پادشاہاں را

البتہ غنیؔ کو اس بات کا یقین ہے کہ امیروں کی عیش کوشیوں کے نتیجے میں جب غریبوں کا خون کھول اٹھے گا۔ وہ اپنی بہت سی مصیبتوں کا خاتمہ کر سکیں گے۔ چنانچہ تباہی میں تعمیر کو مضمر دیکھ کر وہ درد کے حد سے گذرنے کو غالب طبع ہی دوا ہو جانے کے برابر سمجھتا ہے اور کہتا ہے ع

حاجت از حد چو رود دست دہد استغنا

غنیؔ دلوں میں اضطراب کا لاوا پکنے کو ہی کافی نہیں سمجھتا۔ وہ دلوں کے تپش کو یکجا کر کے بروے کار لانے کی بات کرتا ہے۔ اور کہتا ہے ؎

غنیؔ در ملک دونان انقلابے آرزو دارم

وہ ایسے وقت پر اہل دولت اور اہل سیاست کی دوستی پر تکیہ کرنے کو اپنا آپ ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف گردانتا ہے۔ کیونکہ اسکی نظر میں خود غرض اور ابوالہوس لوگوں سے بڑھ کر وطن کا کوئی خطرناک دشمن ہو نہیں سکتا۔ غنیؔ کی نظر میں ایسے خود غرض عناصر بظاہر بڑے خوش وضع اور خوش گفتار ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی چرب زبانی اور چاپلوسی میں نہ آنا چاہیئے۔ جو شخص ایسے لوگوں کی باتوں میں آکر ان کے وعدوں پر بھروسہ کرے گا غنیؔ کی نظر میں اس جیسا کوئی احمق نہ ہو گا خود غنیؔ کے الفاظ میں ؎

بر تواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی است
پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

غنیؔ کی نظر میں ایسے لوگوں کی نرم روی کی پالیسی کتنی خطرناک ہو سکتی ہے خود غنیؔ سنیئے ؎

زنہار مکن تکیہ بر افتادن سرکش
افتادن سرکش بود افتادن آتش

غنیؔ ایسے لوگوں کی نمائشی شرافت لوگوں کے پھانسنے کے لئے ایک فریب سے زیادہ وقعت نہیں دیتا چنانچہ اپنے ٹھوس

تجربے کی بنیاد پر کہہ اٹھتا ہے کہ ؎

سنگین دل است ہر کہ بظاہر ملائم است
پنہان درون پنبہ نگر پنبہ دانہ را

حکمت اور بصیرت کے ایسے موتی اگلنے کی بدولت ہی ایک شاعر "دیدۂ بینائے قوم" تسلیم کیا جاتا ہے۔ غنی سبک ہندی کی آبیاری کرنے والے شاعروں میں اس لحاظ سے ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے کہ وہ تشبیہ و تمثیل اور دعویٰ و دلیل کو رسمی اور محض روایتی سخن سنجی تک محدود نہیں ہونے دیتا بلکہ درپیش حالات و واقعات کے تعلق سے اپنے قاری کو بھی عرفان و آگہی بخشتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر ؎

کدام باز ندانم در آشیان بندی است
کہ ہست حکم پرِ کاہ باں مرغانے را

اپنا گھونسلہ بنانے کے لئے دوسرے پرندوں کے پر نوچنے والے بھی کب تک خیر منائیں گے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنے والا شاعر کشمیر یہ بات کرتا یوں بیان کرتا ہے۔ ؎

کند خلخال در ہر لحظہ فریاد
کہ حسنِ گلرخاں پا در رکاب است

غنی کے شاعری میں کشمیریوں کی حالت اور کشمیری طرزِ معاشرت جس خاص مقامی رنگ میں ڈھل کر وجود میں آگئی ہے ایک غیر کشمیری قاری اس کی نزاکتوں سے پوری طرح محظوظ نہیں ہو سکتا۔ مثال

کے طور پر کشمیر میں پانی کی بہتات ہونے کے سبب غنیؔ کے دور میں پن چکیاں جگہ جگہ بنائی گئیں تھیں اور تفہیم معانی کے لئے یہ پن چکی "آسیا" ترسیل وابلاغ کی خاص خدمت انجام دے سکے ہے یہ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

روزی ما می شود آخر نصیبِ دیگراں
طالع برگشتہ ہمچوں آسیا داریم ما

کسے کز چرخ لطفے دید جورے در قفا دارد
چو آں خوشہ کہ سرسبزی ز آبِ آسیا دارد

زبردست اضطراب و زیر دست آسودگی دارد
دو شاہد بر کلام من دو سنگِ آسیا باشد

پہلے شعر میں اپنے سماج کے استحصال کنندگان کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک آہ جگر سوز کو ریکارڈ کیا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں وقتاً فوقتاً کی جانے والی اشک شوئی و نام نہاد غریب پروری کے پس پردہ کارفرما ظالمانہ عزائم سے باخبر کیا گیا ہے اور تیسرے شعر میں بوالہوس لوگوں کی اس حماقت آمیز سب د روز کی پریشانی پر زہر خند کیا گیا ہے جو انہیں مادی مقاصد اور دنیوی علوم تبت کے لئے کہیں قرار ہی نہیں لینے دیتی۔ اسی طرح سے چرب دست کشمیری قوم کی سوزن کاری ساری دنیا میں مشہور رہے اور غنیؔ کے زمانے میں بھی سوئی سے گل بوٹے بنانے کا رواج عام تھا اب دیکھئے سوئی کے پردے

میں شاعر کشمیر کونسے گل کھلاتا ہے۔ اور وہی نالہ و بکا کس کس ڈھنگ سے بلند ہوتا ہے ؎

ہمچو سوزن دائم از پوشش گریزانیم ما
جامہ بہرِ خلق می دوزیم و عریانیم ما

بیدردی کا یہ منظر نامہ بھی دیکھیئے ؎

ہیچ گہ از سینۂ صد چاک ما یادے نکرد
گرچہ بستم رشتہ بر انگشت سوزن بارہا

غنیؔ کی شاعری منجملہ اور خصوصیات سے کشمیریوں کی اجتماعی سوچ مزاج اور اجتماعی لاشعور کی آئینہ دار بھی ہے۔ کشمیریوں کی صوفیانہ طرز فکر اور طنزیہ طرزِ گفتار کا نہایت عمدہ نمونے بھی کلام غنیؔ میں دستیاب ہوئے ہیں۔ مثلاً بے مہری زمانہ پر یہ پھبتیاں ؎

گوئی کہ در تنور فلک قحط ہیزم است
تا اشتہا نسوخت نشد پختہ نان ما

× × ×

آگہ نشد طبیب ز دردِ نہان ما!
این نبض ما خموش تر است از زبان ما

آفاق میں مشہور رہی ہوئی اس قوم نجیب کو روبزوال دیکھ کر شاعر کے دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور اس شعر کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ ؎

امروز منم شہرۂ عالم ز نحیفی

عمر لیست کہ از ضعف فتادم ز زبانہا

کشمیریوں کے بدلتے ہوئے کردار کو دیکھ کر غنی کا دل حسرت زدہ ایک گونہ یاسیت کا رنگ پکڑنے لگتا ہے اور اصلاح پذیر نہ ہو سکنے کی مایوسی کے تحت وہ اس معاشرے پر خون کے آنسو یوں بہانے لگتا ہے ۔

کنج را بہ تکلف نتوان راست نمودن

کے تیر توان ساختن از چوب کمانہا

غنی کی اس مایوسی کا سبب اہل وطن کی وہ روش ہے جس کو وہ یوں بیان کرتا ہے کہ ظالم کو ظلم کی مشقیں جاری رکھنے کا حوصلہ خود مظلوموں کی نا سمجھی اور غلط روی سے بڑھتا ہے چنانچہ اسی مفہوم کو شاعر یوں ابھارتا ہے ۔

ز پہلوی ضعیفانست گرمی پشت سرکش را

پر کاہے کہ بینی بال پرواز است آتش را

لیکن بحیثیت مجموعی غنی قنوطیت کا شاعر نہیں ۔ وہ عقل کی مسلط کردہ زنجیروں کو توڑنے کے لئے جنون عشق کا متلاشی بھی ہے اور اس کی ضرب کلیمی کے نتائج سے پر امید بھی ۔ اسی بصیرت کے تحت اس نے اپنے دیوان کا پہلا شعر یہ رہنے دیا ہے کہ ۔

جنونے کو کہ از قید خرد بیروں کشم پا را
کنم زنجیر پائے خویشتن دامانِ صحرا را

گویا اگر پابندی بھی اختیار کرنی ہے تو وسیع تر انسانی برادری کی پابندی مستحسن ہو سکتی ہے۔ مقصد بلند ہو تو راستے کی مشکلیں اور آزمائشیں رکاوٹ نہیں بن سکتیں غنی اس مفہوم کو کس خوبصورتی سے بیان کرتا ہے ؎

گر فلک کار ترا برہم زند از جا مرو
جامہ را خیاط سازد قطع بہر دوختن